رکھنے کے لئے امیر و قاضی مقرر تھے، ہماری تحقیق کے مطابق اجودھیا کے اولین قاضی شیخ معین الدین چشتی اجمیری کے خواجہ تاش اور پیر بھائی قاضی قدوۃ الدین بن میرک شاہ اسرائیلی اودھی ہیں جن کی وفات اجودھیا ہی میں ۶۰۵ھ/ ۱۲۰۸ء میں ہوئی، کتاب کے پہلے باب میں ان کا مختصر سا تذکرہ موجود ہے اس وقت سے لے کر تقریباً اٹھارہویں صدی عیسوی تک اجودھیا پر اسلامی تہذیب و ثقافت چھائی رہی اس مدت میں اجودھیا کے افق سے علم و فضل کے ایسے ایسے آفتاب و ماہتاب چمکے جن کی تابانیوں کے سامنے خود دارالخلافہ دہلی کے علمائے نامدار کے چراغ مدھم پڑ گئے جن کے تذکرے اس کتاب میں آپ پڑھیں گے اسی سرزمین میں عام روایت کے مطابق حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام کے صلبی صاحبزادے اور جانشین حضرت شیث علیہ السلام کا مدفن ہے جس کی زیارت کو مسلمان اپنے لے سرمایۂ سعادت سمجھتے ہیں اور آج بھی پچاسوں ایکڑ پر پھیلے ہوئے قبرستان اور خانقاہوں و مزارات کے کھنڈرات زبان حال سے یہ شہادت دے رہے ہیں کہ اس ارض مترک پر اسلامی قافلہ کبھی آ کر ٹھہرا تھا۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے ☆ کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

یہ تفصیلات بتارہی ہیں کہ پچھلی صدیوں میں ایک مقدس مرکز ہونے کی حیثیت سے اجودھیا کے احوال بدلتے رہے ہیں کبھی یہ بودھوں کا مرکز توجہ رہا ہے تو کبھی جینیوں نے اپنی عقیدت کے نذرانے اس پر نچھاور کئے ہیں کبھی علماء اسلام اور مشائخ تصوف نے اپنی علمی و روحانی سرگرمیوں کا اسے محور بنایا تو کبھی شیومت اور وشنومت کے پجاریوں کا یہ مقصود نظر رہا، غرضیکہ اس کا رشتہ مختلف مذہبوں کی تاریخ سے پیوستہ رہا ہے اور مختلف ادوار میں مختلف مذہبی جماعتوں نے اپنے اپنے طور پر اسے عزت و عظمت کا مقام عطا کیا ہے اس لئے اس شہر پر کسی ایک مذہب کا دعویٰ تاریخی اعتبار سے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

بابری مسجد حقائق اور افسانے

یکم فروری ۱۹۸۶ء (۲۱/ جمادی الثانی ۱۴۰۶ھ) سنیچر کے دن ''بابری مسجد'' واقع اجودھیا ضلع فیض آباد، ناجائز اور غیر منصفانہ طور پر نہایت ڈرامائی انداز سے ''رام جنم استھان مندر'' میں تبدیل کردی گئی، اس حادثہ فاجعہ پر مسلمانوں کو جس قدر غم ہو کم ہے۔

''آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں''

یہ ظالمانہ اقدام محض جبر و تشدد اور کثرت و طاقت کے نشہ میں کیا گیا ہے، لیکن دنیا کو فریب دینے کے لئے اس پر عدالت کے فیصلے کی چادر ڈال دی گئی ہے حالانکہ اس غیر قانونی عمل کو عدالت کا فیصلہ کہنا خود عدلیہ کی توہین ہے اور اب اس نام نہاد فیصلہ کو حق بجانب اور درست ثابت کرنے کی غرض سے ''بابر'' اور اس کی جانب منسوب ''بابری مسجد'' کی تاریخ مسخ کرنے کی ملک گیر تحریک چلائی جارہی ہے، اس رسوائے زمانہ تحریک کا سلسلہ اگرچہ عرصۂ دراز سے جاری تھا مگر اسے آج کل تیز تر کردیا گیا ہے اور وشو ہندو پریشد، آریہ پرتی ندھی سبھا، بھارتیہ جنتا پارٹی، وغیرہ فرقہ پرست تنظیمیں چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں کہ ''بابری مسجد کو بابر شاہ نے رام جنم استھان مندر توڑ کر اس کے کھنڈر پر تعمیر کرایا تھا، اس لئے اس مسجد کو ہندو فرقہ کے حوالہ کرنے کا فیصلہ حق و انصاف پر مبنی ہے۔''

اس بے بنیاد اور من گھڑت افسانے کو ایک صحیح اور سچا واقعہ باور کرانے کے لئے علم و تحقیق کی آبرو کو بالائے طاق رکھ کر پوری جسارت کے ساتھ تزک بابری، آئین اکبری اور عالم گیری نامہ جیسی اہم تاریخی کتابوں کا بالکل غلط طور پر حوالہ بھی دیا جارہا ہے۔

اس لئے جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ منعقدہ ۲۱/۲۲/ فروری ۱۹۸۶ء نے ضرورت محسوس کی کہ بابری مسجد کی صحیح تاریخ عوام کے سامنے پیش کی جائے تاکہ سرکاری

وغیر سرکاری ذرائع ابلاغ کی مدد سے پھیلائی ہوئی غلط فہمی کا یہ بادل چھٹے جس نے ملک کی فضاء کو خطرناک حد تک مسموم بنادیا ہے، اور ملک کا انصاف پسند طبقہ کذب و افتراء کی تاریکیوں میں بھٹکنے کے بجائے اس انتہائی حساس اور نازک معاملہ میں علم و تحقیق کی روشنی میں غور کرسکے۔ چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کے صدر محترم حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم نے یہ خدمت احقر کے سپرد کی، مظلوم بابری مسجد کے سلسلہ میں یہ تحریر اسی حکم کی تعمیل میں سپرد قلم کی گئی ہے اور قارئین ماہنامہ دارالعلوم کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

کیا بابر اجودھیا آیا تھا؟

چونکہ یہ مظلوم مسجد بابر کی جانب منسوب ہے، اس لئے عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اسے بابر نے تعمیر کرایا تھا، پھر اس مفروضہ کی بنیاد پر یہ افسانہ گھڑ لیا گیا کہ بابر نے اجودھیا آکر ''رام جنم استھان مندر کو گرایا'' اور پھر اس کی جگہ پر یہ مسجد بنوائی چنانچہ حکومت یوپی کے محکمہ اطلاعات کی جانب سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''اتر پردیش'' میں بعینہٖ یہی بات کہی گئی ہے۔

''۱۹۲۸÷ میں بابر یہاں (اجودھیا) آیا تھا اس نے ایک ہفتہ قیام کیا اور جنم استھان مندر کو گرا کر ایک مسجد تعمیر کرائی جو اس مندر کے ملبہ پر تعمیر کی تھی''۔ (ماہنامہ اتر پردیش شمارہ اپریل ۱۹۸۴÷ ص:۲۷)

اس لئے پہلے یہ طے ہونا ضروری ہے کہ ''بابر'' اجودھیا آیا تھا! کیونکہ (جنم استھان مندر) گرانے کی داستان اسی دعویٰ کی بنیاد پر گھڑی گئی ہے۔

مؤرخین ہند خواہ مسلم دور حکومت سے تعلق رکھتے ہوں یا اس عہد کے بعد کے ہوں سب اس پر متفق ہیں کہ ''بابر'' کے حالات میں مستند ترین ماخذ خود اس کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ سوانحی روزنامچہ ہے جو علمی حلقوں میں ''تزک بابری'' کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے، ''بابر'' نے ۸۹۲ سے جبکہ اس کی عمر صرف بارہ سال تھی، اسے لکھنا شروع کردیا تھا اور اپنے مرضِ وفات میں مبتلا ہونے سے چھ ماہ قبل یعنی ۹۳۶ھ تک اس سلسلہ کو جاری رکھا تزک

میں اس کی آخری تحریر ۳/محرم ۹۳۶ھ کی ہے اور اسی سال رجب کے مہینہ میں بیمار ہوا اور اسی بیماری میں ۵/جمادی الاولیٰ ۹۳۷ھ کو انتقال کرگیا اس طرح یہ روزنامچہ آخری ایک سال کے علاوہ اس کے پورے سوانح حیات کو حاوی ہے جس میں اس نے اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کو تفصیل سے قلم بند کردیا ہے حتیٰ کہ وہ جن مقامات پر گیا ہے وہاں کے عوام کی حالت، جانوروں کی قسمیں، آب و ہوا، باغات اور عمارتوں کا تذکرہ بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ کرتا ہے، اصل کتاب ترکی زبان میں ہے، اس کا سب سے پہلا ترجمہ ''اکبر'' کے حکم سے خانخاناں عبدالرحیم نے فارسی میں کیا تھا، جو اب تک غیر مطبوعہ ہے، اس کے بعد انگریز مؤرخ ''اے، ایس بیورج'' نے دی بابرنامہ ان انگلش کے نام سے انگریزی میں ترجمہ کیا جو دو جلدوں میں ۱۹۲۲÷ میں شائع ہوا، یونیورسٹیوں اور دیگر علمی حلقوں میں عام طور پر یہی ترجمہ رائج ہے، مسز بیورج نے ترجمہ کے ساتھ تفصیلی فٹ نوٹ بھی لکھا ہے، جس سے اس کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے ''بابرنامہ'' کے نام سے اردو میں بھی ترجمہ ہوگیا ہے، اب یہی انگریزی اور اردو کے دونوں ترجمے تذکرہ نویسوں کے لئے ماخذ و مرجع کا کام دیتے ہیں، کوئی بھی شخص ان ترجموں کو اول سے آخر تک پڑھ جائے اسے ان میں کہیں بھی ''بابر'' کے ''اجودھیا'' آنے کا ذکر نہیں ملے گا، البتہ ۹۳۵ھ کے واقعات کے ضمن میں اس کی یہ تحریر ضرور ملتی ہے۔

''ہفتہ ۷/رجب کو ہم نے ''اودھ'' سے دو تین کوس (چھ میل) پر ''گھاگھرا'' اور ''سردا'' (ساردا) کے سنگم پر قیام کیا (یہ سنگم بہرائچ میں ہے) اس وقت تک ''شیخ بایزید'' سردا (ساردا) کی دوسری جانب تھا اور سلطان (حسین تیمور) سے خط و کتابت کررہا تھا اس کی دھوکہ بازیوں سے واقفیت کی بناء پر ہم نے بوقت ظہر ''سلطان کو حکم دیا کہ وہ دریا پار کرنے کے لئے تیار ہوجائے، قباچہ کے پہنچنے پر انھوں نے فوراً دریا پار کیا وہاں پچاس گھوڑے اور تین چار ہاتھی موجود تھے وہ مقابلے کی تاب نہ لاسکے اور فرار کی راہ اختیار کی چند لوگ جو گھوڑے سے اتر گئے تھے ان کے سر کاٹ کر حاضر کئے گئے'' (بابرنامہ اردو ۳۳۹)

''بابر'' کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ وہ ''شیخ بایزید'' کی بغاوت فرو کرنے کے

لئے رجب ۹۳۵ھ میں اس دیار میں آیا تھا مگر بقول خود اس کا قیام اجودھیا سے ٦ میل دور سارداکے سنگم پر ہوا، شیخ بایزید کی شکست کے بعد اپنے ایک امیر سید ''میر باقی اصفہانی'' کو اس علاقے کا حاکم مقرر کر کے یہیں سے براہ الٰہ آباد وکٹرہ بہار چلا گیا جہاں سلطان محمود بن سکندر لودھی نے علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ تقریباً ایک ماہ بہار کے علاقے میں گذار کر واپس لوٹا اور واپسی کے موقع پر بھی وہ اجودھیا سے کافی فاصلے سے گذرا، جیسا کہ تزک کی درج ذیل تحریر سے ظاہر ہے۔

''بروز دوشنبہ ۲۲ر رمضان کو ہم چوپادہ میں پہنچے چتر مکھ کے راستے دریائے سرجو کے کنارے ہوتے ہوئے بہار اور سردا (ساردا) کے قصبوں سے فارغ ہو کر اور دس کوس (۲۰ میل) چلنے کے بعد دریائے سرجو کے کنارے کیلرہ نامی گاؤں میں جو فتح پور کے علاقے میں ہے قیام کیا، ہم نے کئی دن اس مقام پر گذارے، یہاں آب رواں ہے، اچھی عمارتیں ہیں اشجار خاص طور پر آم کے درخت اور رنگ برنگ کی چڑیاں ہیں، پھر ہم نے غازی پور کی طرف کوچ کا حکم دیا'' (بابر نامہ اردو)

ان دونوں تحریروں کے علاوہ ''تزک بابری'' میں کوئی ایسی عبارت نہیں ملتی جس سے ''بابر'' کے اس دیار میں آنے کا سراغ لگایا جا سکے۔

تزک بابری کے علاوہ طبقات اکبری تالیف خواجہ نظام الدین احمد، اکبر نامہ ابوالفضل، منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی خلاصۃ التاریخ منشی سبحان رائے، تاریخ فرشتہ محمد قاسم فرشتہ، منتخب اللباب محمد ہاشم خافی خان، غرضیکہ کسی بھی معاصر یا غیر معاصر مستند ومعتبر تاریخ میں بابر کے اجودھیا آنے کا ذکر نہیں ملتا، اس لئے جس بنیاد پر مندر توڑ کر مسجد بنانے کی عمارت کھڑی کی گئی ہے، جب اس بنیاد ہی کا وجود نہیں تو عمارت کا جو حال ہوگا اہل نظر سے مخفی نہیں۔

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

''بابر'' کے حالات میں اس وقت جتنی بھی کتابیں دستیاب ہیں ان میں ''بابر'' کے

نہ صرف اجودھیا بلکہ کسی بھی مقام پر مندر توڑنے کا ذکر نہیں ہے، حتیٰ کہ جدوناتھ سرکار، ایسٹ اور ڈاوسن نے بھی ''بابر'' کی مندر شکنی کا کوئی واقعہ نقل نہیں کیا ہے، جبکہ یہ مؤرخین مسلم حکمرانوں کی مندر شکنی کے واقعات میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

بابر کی ایک وصیت

ان تاریخی شواہد کے علاوہ خود ''بابر'' جس ذہن ومزاج کا حکمراں ہے اس کے پیش نظر یہ امر بعید از قیاس ہے کہ وہ کسی بھی مذہبی عبادت گاہ پر غلط نگاہ ڈالے گا، اس کے اس مزاج کو سمجھنے کیلئے وہ وصیت نامہ کافی ہے جو اس نے اپنے بڑے بیٹے ہمایوں کے لئے قلم بند کیا تھا وہ اس میں ہمایوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

اے فرزند! ہندوستان کی سلطنت مختلف مذاہب سے بھری ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں اس کی بادشاہت عطا کی، تم پر لازم ہے کہ اپنے لوح دل سے تمام مذہبی تعصبات کو مٹا دو، اور ہر مذہب کے طریقے کے مطابق انصاف کرو، تم خاص کر گائے کی قربانی کو چھوڑ دو، اسی سے تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر سکو گے، پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسانات سے دبی رہے گی، جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے، اس کے مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہ کرو، عدل وانصاف اس طرح کرو کہ بادشاہ رعایا سے اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے، اسلام کی ترویج ظلم کی تلوار سے زیادہ احسانات کی تلوار سے ہو سکتی ہے، شیعوں اور سنیوں کے اختلاف سے چشم پوشی کرتے رہو، ورنہ اسلام میں ان سے کمزوری پیدا ہوتی رہے گی، مختلف عقائد رکھنے والی رعایا کو اس طرح ان عناصر اربعہ کے مطابق ملاؤ جس طرح کہ انسانی جسم ملاتا ہے، تا کہ سلطنت کا ڈھانچہ اختلافات سے پاک رہے، یکم جمادی الاولیٰ ۹۳۵ھ'' (انڈیا ڈی ڈائڈ ڈص ۳۹ از ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ ہند)

ان دلائل وشواہد کی روشنی میں ایک دیانت دار مؤرخ اور حقیقت پسند مبصر یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہے کہ ''بابر'' مندر شکنی کے الزام سے قطعا بری ہے، چنانچہ پروفیسر ''شری رام شرما'' اپنی مشہور کتاب ''مغل امپائران انڈیا'' میں پوری صفائی سے لکھتے ہیں:

''ہم کو کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی کہ ''بابر'' نے کسی مندر کو منہدم کیا یا کسی ہندو کی ایذا رسانی محض اس لئے کی کہ وہ ہندو ہے۔'' (ص ۵۵ ایڈیشن ۱۹۴۵ء

بحوالہ معارف فروری ۸۶ء)

تلاش حقیقت

جب یقینی طور پر یہ معلوم ہوگیا کہ ''بابر'' اجودھیا آیا ہی نہیں تو اس کے بابری مسجد تعمیر کرانے کا سوال نہیں پیدا ہوتا، لہٰذا اب ہمیں تاریخ ہی کی روشنی میں یہ پتہ لگانا چاہئے کہ اس مسجد کا بانی حقیقتاً کون اور اس نے اسے کب تعمیر کرایا ہے، اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشیں رہنی چاہئے کہ بابری مسجد اجودھیا ہندوستان میں موجود لاکھوں مسجدوں کے مقابلے میں کسی خصوصی امتیاز کی حامل نہیں ہے، اسی لئے مؤرخین جس طرح عام مسجدوں کی تاریخ بیان کرنے کا عام طور پر اہتمام نہیں کرتے بعینہٖ ''بابری مسجد اجودھیا'' کے بارے میں بھی ان کا یہی رویہ ہے، بالفرض اگر یہ مسجد کسی خصوصی اہمیت کی حامل ہوتی یا اس کی تعمیر کے ساتھ کوئی جذباتی واقعہ وابستہ ہوتا یا کم از کم اسے کسی بادشاہ کی تعمیر کا شرف حاصل ہوتا تو مؤرخین اس طرح سے اس کے بارے میں خاموش نہ رہتے بلکہ اس کی تفصیلات ضرور لکھتے لیکن مؤرخین کے اس مکمل سکوت کے باوجود ''بابری مسجد'' کی تاریخ تاریکی میں نہیں ہے بلکہ اس میں نصب کتبوں کی بناء پر آئینہ کی طرح روشن ہے۔

آج کی دنیا میں کتبات کی جو اہمیت ہے، وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں، آج حکومتیں ان کی فراہمی اور حفاظت پر کڑوڑوں روپئے خرچ کر رہی ہیں، اور ان سے صرف عمارتوں ہی کی تاریخ معلوم نہیں کی جاتی بلکہ قوموں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی تاریخ کی تدوین میں انہیں مستند ترین مواد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

بابری مسجد اجودھیا کے کتبے

اسے اتفاق ہی کہئے کہ ''بابری مسجد'' میں ایک کے بجائے تین کتبے نصب کئے گئے تھے جن میں دو تاریخی حیثیت سے خاص اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ان میں مسجد کی تعمیر کا سن اور بانی کے نام کی تصریح موجود ہے۔

(ا) یہ کتبہ پتھر کی دو میٹر لمبی اور ۵۵ سینٹی میٹر چوڑی تختی پر ہے جو مسجد کے مسقّف حصہ کے درمیانی مرکزی در کے اوپر نصب ہے، جس پر بسم اللہ کے علاوہ تین سطروں میں آٹھ اشعار لکھے ہوئے ہیں، جن میں پانچویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں بانی کا نام نسبت کی صراحت کے ساتھ نظم کیا گیا ہے اور آٹھویں شعر کا دوسرا مصرعہ تعمیر کی تاریخ پر مشتمل ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم		
بنام آنکہ او داناست اکبر	کہ خالق جملہ عالم لامکانے	درود مصطفیٰ بعد از ستائش
کہ سرور انبیاء زبدہ جہانے	فسانہ درجہاں بابر قلندر	کہ شد در دور گیتی کامرانے
چناں کہ مطلع کشور گرفتہ	زمیں را چوں مبارز آسمانے	دراں حضرت یکے سید معظم
کہ نامش میر باقی اصفہانے	مشیر سلطنت تدبیر ملکش	کہ زیں مسجد حصار مہستانے
خدایا درجہاں تابندہ ماند	کہ خیر و بخت و تخت وزندہ گانے	دریں عہد و دریں تاریخ میموں
کہ نہ صد پنج وسی بودہ نشانے	(ان دو سطروں میں عربی میں کچھ لکھا ہوا ہے جو پڑھا نہیں جاسکا) (حبیب الرحمٰن)	

اس کتبے کے اشعار میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا پھر نبی کریم ...... پر درود ہے اور آپ ......کو تمام انبیاء کا سردار اور خلاصۂ کائنات کہا گیا ہے، پھر دو شعروں میں ''بابر'' کی تعریف اور اس کی فتح و کامرانی کو نہایت لطیف اور بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے، یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے، کہ اس موقعہ پر بابر کو بادشاہ کے بجائے قلندر کہا گیا ہے، یہ لفظ صوفیوں کی اصطلاح میں مرنجاں مرنج اور ہر قسم کی مذہبی تعصب سے بے نیاز شخصیتوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

پھر بیان کیا گیا ہے کہ ''بابر'' کے درباریوں میں ایک صاحب عظمت سید ہیں جن کا اسم گرامی ''میر باقی اصفہانی'' ہے پھر ''میر باقی'' کے انتظام ملکی کی تعریف ہے اس کے بعد کے شعر میں بتایا گیا ہے کہ ان ہی ''میر باقی'' کی بدولت یہ مسجد روشن ضمیروں کے لئے حصار بنائی گئی ہے اس کے بعد کے چار شعروں میں ان کے لئے دعاء ہے کہ خدایا دنیا میں ان کے اس خیر یعنی مسجد اور ان کے مقام و مرتبے اور زندگی کو تابندہ رکھ تا کہ ۹۳۵ھ کی یہ یادگار باقی اور پائیدار رہے۔

''مسز بیورج'' نے اپنے ترجمہ ''دی بابر نامہ ان انگلش'' کی دوسری جلد کے ضمیمہ میں ''بابری مسجد اجودھیا'' کے کتبات کے عنوان کے تحت منبر کے بائیں سمت والے کتبہ کے علاوہ، مندرجہ بالا کتبے کو بھی درج کیا ہے، لیکن انھوں نے اس کے آٹھ شعروں میں سے شروع کے صرف تین اشعار نقل کئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ بقیہ اشعار کو وہ پڑھ نہ سکیں اس لئے انہیں چھوڑ دیا۔

۲،۳ یہ دونوں کتبے مسجد کے اندرونی حصہ میں ''منبر'' کے داہنی اور بائیں جانب تھے۔

(داہنی سمت کا کتبہ) (۲)

بمنشائے بابر خدیوں جہاں — بسائیکہ با کاخ گردوں عناں
بنا کرد ایں خانۂ پائیدار — امیر سعادت نشاں میر خان
بماند ہمیشہ چنیں بانئش — چناں شہریار زمیں وزماں

(بائیں جانب کا کتبہ) (۳)

بفرمودۂ شاہ بابر کہ عدلش — بنائیست با کاخ گردوں ملاقی
بنا کردہ ایں مہبط قدسیاں را — امیر سعادت نشاں میر باقی
بودخبر باقی وسال بنائش — عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی
۹۳۵ھ

معمولی سے فرق کے علاوہ ان دونوں کتبوں کے مفہوم میں یکسانیت ہے البتہ دوسرے کتبہ کا آخری شعر دعائیہ ہے اور تیسرے کے آخری جملہ سے تاریخ تعمیر نکلتی ہے اس

آخری کتبہ کو مسز بیورج نے بھی نقل کیا ہے لیکن ان سے اس کے پڑھنے میں غلطی ہوئی ہے، جس سے تعمیر کی معنویت متاثر ہوتی ہے وہ آخری شعر کو اس طرح لکھتی ہیں۔

بود خیر باقی چو سال بنائش — عیاں شد کہ گفتم بود خیر باقی

جبکہ صحیح اس طرح ہے۔

بود خیر باقی وسال بنائش — عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی

۲۷/ مارچ ۱۹۳۴÷ مطابق ۱۱/ ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ کو اجودھیا میں ایک زبردست فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا، اس موقع پر فسادیوں نے ''بابری مسجد'' میں گھس کر توڑ پھوڑ کیا تھا اسی وقت ان دونوں کتبوں کو بھی اکھاڑ لے گئے، لیکن بعد میں منبر کے بائیں جانب والے کتبے کی ایک نقل تیار کرا کے تہور خان ٹھیکیدار نے نصب کرا دیا البتہ دائیں جانب کی نقل وہ بھی نہ کرا سکے۔

سید بدر الحسن فیض آبادی کے پاس اس ضائع شدہ کتبے کی ایک نقل موجود تھی اسی نقل کے حوالہ سے یہ کتبہ یہاں درج کیا گیا ہے۔

ان تینوں کتبوں کی فلم اور اس کا فوٹو (ضمیمہ فارسی وعربی ہندوستانی کتبات ۱۹۶۵÷ ناگپور میں موجود ہے) جسے حاصل کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔

مسجد کی مرکزی در والا اصلی کتبہ اور منبر کی بائیں جانب والا نقل شدہ کتبہ یہ دونوں کتبے ۱۹۴۹÷ سے پہلے تک مسجد میں موجود تھے، اب موجود ہیں یا وہ بھی بیراگیوں کے دست کرم کے شکار ہو گئے خدا ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ تقریباً ۴۳ سال کی طویل مدت سے مسلمانوں کا اپنی اس قدیم عبادت گاہ کے پاس سے گذرنا بھی ممنوع ہے اس کے اندر جانا تو بہت دور کی بات ہے اس لئے اس وقت ان کتبوں کے متعلق کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔

لیکن ان کتبوں کے اب مسجد میں ہونے یا نہ ہونے سے ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ ان کی مستند نقلیں حکومت کے محکمہ آثار قدیمہ اور تاریخ کی معتبر کتابوں میں موجود ہیں۔

یہ کتبے آج بھی شہادت دے رہے ہیں کہ ''بابری مسجد'' اجودھیا کا بانی ''شاہ بابر''

نہیں بلکہ اس کا ایک امیر ''میر باقی اصفہانی'' تھا جسے بابر نے ۹۳۵ھ/ ۱۵۲۸÷ میں علاقہ اودھ کا حاکم مقرر کیا تھا ''میر باقی'' نے اسی تقرری کی یادگار کے طور پر اس مسجد کی تعمیر کرائی تھی، جیسا کہ پہلے کتبہ کے آخری مصرعہ ''کہ نہ صد پنج وسی بودہ نشانی'' سے واضح ہے۔

اور تیسرے کتبہ کے دوسرے شعر ''بنا کرد ایں مہبط قدسیاں'' سے اشارہ ملتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر عدل وانصاف کے مطابق ہوئی ہے کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے فرشتوں کی درودگاہ وہ مقام کبھی بھی نہیں ہوسکتا جس کی بنیاد ظلم وجور پر رکھی گئی ہو، اور اسلامی قوانین کی رو سے کسی مذہب کی عبادت گاہ کو منہدم کرنا ظلم وزیادتی ہے، اور اس غیر منصفانہ حرکت سے آنحضرت ...... نے سختی سے منع فرمایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مسز بیورج نے ان کے ترجمہ اور تشریح میں کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ ''مسجد'' جنم استھان کو توڑ کر بنائی گئی ہے، اسی طرح ولیم ارسکن، آزبروک ولیم جنھوں نے بابر کے عہد کی تاریخ لکھی ہے بابر کے کسی مندر توڑنے کا ذکر نہیں کرتے۔

ان مستند تاریخی شواہد کے علاوہ مسجد کا جائے وقوع بھی یہی کہتا ہے کہ یہاں مسجد سے پہلے مندر نہیں ہوسکتا، کیونکہ مسجد کے احاطے کی چہار دیواری سے متصل پورب اور دکھن سمت ''گنج شہیداں'' ہے یعنی ان شہیدوں کے مزارات ہیں جو سپہ سالار مسعود غازی کے رفقاء میں سے تھے اور دو قدم فاصلے پر ''قاضی قدوہ'' کی قبر ہے جو خاندان قدوائی کے مورث اعلیٰ تھے۔

مسعود غازی پانچویں صدی ہجری میں اس دیار میں آئے تھے، ...اس لئے اس مقام پر ان کے رفقاء کے مزارات کا ہونا یہ بتاتا ہے کہ اس حصۂ زمین پر اس وقت کوئی مندر وغیرہ نہیں تھا کیونکہ کسی مندر کے متصل شہیدوں کے مزارات نہیں بنائے جاتے ان مزارات کے بعد محلّہ قضیانہ اور ایک اور مسلم محلّہ کی آبادی شروع ہوجاتی تھی جس میں شیخ نصیرالدین چراغ دہلیؒ کا آبائی مکان تھا، اور مسجد کے پورب سمت ذرا سے فاصلے پر محلّہ بیگم پورہ تھا، جو نوابان اودھ کے دور تک خالص مسلم آبادی پر مشتمل تھا، اور مسجد کے اتر جانب احاطہ مسجد سے بالکل متصل تقریباً پندرہ میٹر چوڑی قدیم سڑک ہے اسی سڑک کے متصل اتر

پورب سمت میں جنم استھان کا احاطہ ہے۔ الحاصل اس قدیم سڑک سے دکھن جانب خالص مسلمانوں کی آبادی اور ان کے قدیم مزارات ہیں اس جانب نوابان اودھ کے دور سے پہلے نہ ہندو آبادی تھی اور نہ کوئی مندر وغیرہ ان کے سارے مندر سڑک کے اتری سمت میں تھے جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی جگہ پہلے ہی سے مسلمانوں کی ملکیت میں تھی اس لئے یہاں کسی مندر کے ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

چنانچہ آج سے تقریباً آٹھ، نو سال قبل حکومت نے محکمہ آثار قدیمہ کے ذریعہ ''بابری مسجد'' کی مغربی دیوار سے بالکل متصل بڑے پیمانے پر کھدائی کرائی تھی اس کھدائی سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوا کہ یہاں مسجد سے پہلے کسی قسم کی کوئی عمارت نہیں تھی کیونکہ کھدائی کے بعد کسی عمارت کے کوئی آثار اس جگہ نہیں پائے گئے اس کھدائی کی رپورٹ حکومت کے پاس محفوظ ہے ان دلائل وقرائن کے بعد ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں ایک ہندو محقق کی تحقیق بھی پیش کردیں تاکہ حقیقت حال اچھی طرح روشن ہوکر سامنے آجائے۔

جنم استھان کے بارے میں ایک ہندو محقق کی تحقیق

ڈاکٹر آر، ایل شکلا استاذ دہلی یونیورسٹی دہلی نے ۱۹۸۴÷ میں ایک مقالہ بعنوان (jkedhuxjh iz;/;; ;feFkd) (رام کی نگری اجودھیا جھوٹ یا سچ) لکھا تھا، یہ اقتباس اسی مقالہ سے ماخوذ ہے یہ مقالہ اگرچہ اس قابل ہے کہ اسے پورا نقل کردیا جائے لیکن طوالت کے خوف سے اس کے ضروری اقتباسات اس موقع پر نقل کئے جارہے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ

''بعض مؤرخین ''مہابھارت'' میں بیان کئے گئے ''رام'' کو حقیقی کردار مانتے ہیں یہ مؤرخین رام کا زمانہ ڈھائی ہزار قبل مسیح مانتے ہیں، اور مہابھارت کا زمانہ عیسی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک ہزار پہلے کا بتایا جاتا ہے، اگر ہم اس تحقیق کو صحیح مان لیں تو رامائن میں جن مقامات کا تعلق رام جی سے بیان کیا گیا ہے، ان جگھوں میں عیسیٰ (علیہ السلام) سے ڈھائی ہزار سال پہلے انسانی زندگی کے آثار ملنے چاہئے اسی مقصد کے پیش نظر تین مقامات کی

کھدائی ہوئی ہے: (۱) فیض آباد ضلع میں ''اجودھیا کی (۲) الہ آباد سے ۳۵ کلومیٹر شمال کی سمت واقع موضع ''شرنگویر پور'' کی (۳) اور الہ آباد میں واقع ''بھاردواج'' آشرم کی، اجودھیا میں کھدائی آج سے تقریباً ۲۵ سال پہلے بھی ہوئی تھی اس وقت بھی وہاں آبادی کے نشان عیسیٰ (علیہ السلام) سے ۶۰۰ سال پہلے کے نہیں ملے تھے اور اب سے تقریباً دس سال پہلے دوبارہ بڑے پیمانے پر وہاں (اجودھیا) کھدائی ہوئی، (اس کھدائی سے) بھی آبادی کے متعلق وہی نتیجہ نکلا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) سے (زیادہ سے زیادہ) ۷۰۰ سال قبل کی آبادی کے نشان پائے گئے، اب اگر یہ مان لیا جائے کہ یہی (موجودہ) اجودھیا ''رام جی'' کی نگری تھی جو ان کی جنم بھومی مانی جاتی ہے تو (سوال پیدا ہوتا ہے) کہ رام جی کے زمانہ سے اجودھیا کے زمانے کا تعلق اور جوڑ کیوں نہیں قائم ہوتا، اجودھیا کی آبادی عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانے سے ۶۰۰ یا ۷۰۰ سال پہلے کی ہے جبکہ رام جی کا زمانہ عیسیٰؑ سے ۲۵۰۰ سال قبل یا بعض مؤرخین کی تحقیق کے اعتبار سے اس سے بھی پہلے کا ہے تو پھر اجودھیا رام کی بھومی کیسے ہوسکتی ہے اور اس کا کیا ثبوت ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ مشرقی یوپی، شمالی بہار اور مگدھ کے علاقوں میں پہلے جنگل ہی جنگل تھے ان علاقوں میں تقریباً ۵۰ سے ۶۰ انچ تک بارش ہوتی ہے جس کی بناء پر میدانوں میں جنگل کا پیدا ہوجانا فطری امر ہے، جب تک ان جنگلوں کو کاٹ کر صاف نہیں کیا گیا وہاں بستیوں کا آباد ہونا ممکن نہ تھا ان جنگلوں کی صفائی کا کام انہیں جلا کر یا لوہے کے کلہاڑوں سے کاٹ کر کیا گیا ہے اور جدید تحقیقات سے یہ طے ہو چکا ہے کہ لوہے کا استعمال ان علاقوں میں ۷۰۰ سال قبل از مسیح نہیں تھا۔

قدیم پالی ادب میں بڑی بڑی حکومتوں کا ذکر ہے جنہیں ''مہاجن پد'' کہا جاتا تھا، نیز پالی ادب میں ''اجودھیا'' کا بھی ذکر ہے اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''بدھ'' کے عہد میں اس علاقہ میں حکومت کا قیام ہوگیا تھا، لیکن اس سے پہلے کسی حکومت کے قیام کا ثبوت نہ تو قدیم ادب سے ملتا ہے اور نہ آثار قدیمہ ہی سے، اس لئے جو لوگ اجودھیا کو رام کی جنم بھومی کہتے ہیں ان کے پاس اس کی کوئی بھی دلیل نہیں ہے۔

بالمیکی رامائن (کے مطابق) ''کوشل'' کا پایۂ تخت ''اجودھیا'' سرجوندی کے داہنی سمت سرجو سے ڈیڑھ یوجن (۱۳½ میل) کے فاصلے پر تھا اور سرجو اس سے پچھم سمت تھی، اور آج کا اجودھیا سرجو کے بالکل کنارے پر ہے پھر آج سرجو اجودھیا سے پورب سمت ہے نہ کہ پچھم میں (بالمیکی کے اس بیان سے بھی موجودہ اجودھیا رام کی جنم بھومی نہیں ہوسکتا ہے) (ایٹک سنواد، ماہ نومبر ۱۹۸۴ء ص: ۱۲، ۱۳)

پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ہندو مذہب کی اہم ترین کتاب ''اتھروید'' سے پتہ چلتا ہے کہ لفظ ''ایودھیا'' اسم علم (نام) کے طور پر نہیں بلکہ صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے ''انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی شملہ'' کے فیلو پروفیسر ''بی، بی لال'' جو آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے ڈائرکٹر جنرل بھی رہ چکے ہیں، انھوں نے انکشاف کیا ہے کہ

''کسی ایک جگہ بھی لفظ اجودھیا اسم معرفہ (نام) کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے اس لئے یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ یہ کسی شہر کا نام ہے'' (ہفت روزہ نئی دنیا دہلی شمارہ ۱۸ و ۲۰ مارچ ۱۹۸۶ء ص: ۱۳، ۱۵)

کیا رام کرشن کوشل کے راجہ تھے؟

ان تحقیقات کے علاوہ بعض محققین کی رائے یہ بھی ہے کہ رام کرشن کا ''جن کی راجدھانی (اجودھیا) بتائی جاتی ہے'' وہ کوشل کے راجہ تھے ہی نہیں بلکہ وہ بنارس کے حکمراں تھے۔

چنانچہ اے، ایل باشم لکھتے ہیں:

''یہ بات بھی یقینی نہیں ہے کہ ''رام'' کوشل کا بادشاہ تھا کیونکہ اس افسانے ''رامائن'' کا قدیم ترین نسخہ جو ہمارے پاس ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنارس کا بادشاہ تھا جو تھوڑے زمانے کے لئے ایک اہم حکومت تھی''

(ہندوستان کا شاندار ماضی ص: ۶۷، ۶۸ ناشر ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۲ء)

الحاصل قدیم ہندو ادب اور جدید تحقیقات دونوں کے اعتبار سے موجودہ ''اجودھیا'' کا تعلق رامائن کے کردار (ہیرو) ''رام'' سے کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ اجودھیا کی آبادی رام کے اٹھارہ سو (۱۸۰۰) سال بعد وجود میں آئی ہے، اس لئے علم و تحقیق کی رو سے اجودھیا کو رام جنم بھومی کہنا انتہائی مضحکہ خیز ہے جس کی حیثیت دیومالائی افسانے سے زیادہ نہیں۔

غالبًا اسی بناء پر غیر ملکی سیاح جب ہندوستان کے قدیم آثار کی سیر کے لئے آتے ہیں تو انہیں بنارس، سارناتھ، مگدھ، نالندہ، کھجراہوا، اجنتا وغیرہ کی سرکاری و غیر سرکاری طور پر سیر کرائی جاتی ہے اور ''اجودھیا'' کو بالکل نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

اس لئے جب خود ''اجودھیا'' کا رام جنم بھومی ہونا تاریخی و تحقیقی شواہد سے غلط ہے تو اس میں واقع ایک مسجد کو تقریباً ساڑھے چار سو سال کے بعد متعین کر کے یہ کہنا کہ اسی جگہ رام جی پیدا ہوئے تھے، ایک من گھڑت افسانہ نہیں تو پھر کیا ہے۔

اس افسانہ کی ابتدا اور اس کے مقاصد

رام جی کے زمانہ سے تقریباً سوا چار ہزار سال کے بعد بابری مسجد اجودھیا کی تعمیر ہوئی اگر واقعتاً اس جگہ کوئی مندر ہوتا اور اس اہمیت کا جسے آج ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس کے اوپر ملک کی سالمیت اور یگانگت کو قربان کرنے کا قصد کر لیا گیا ہے تو اس کا ذکر مذہبی اور تاریخی کتابوں میں ضرور ہوتا یا کم از کم محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے کھدائی کے موقع پر اس کے کچھ آثار و نشانات ہی ملتے لیکن اوپر کی سطور میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ''اجودھیا'' کی آبادی کا وجود ''رام جی'' کے زمانے سے تقریباً اٹھارہ سو سال بعد ہوا ہے تو پھر ''رام جی'' کی وہاں پیدائش کیسے ہو سکتی ہے کہ ان کی پیدائش کی یادگار میں اس جگہ مندر بنایا جاتا۔

دراصل ''رام جنم استھان'' کا یہ قضیہ انگریزوں کی منحوس ڈپلومیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پیداوار ہے واجد علی شاہ کے ابتدائی دور میں انگریزوں نے اس افسانہ کے پلاٹ کو تیار کیا، وہ اس طرح کہ ایک بدھشٹ نجومی کو پہلے سے تیار کیا چنانچہ اس نے

انگریزوں کی منشاء کے مطابق زائچہ کھینچ کر ''جنم استھان'' اور سیتا رسوئی گھر کو ''بابری مسجد'' کے احاطہ کے اندر ہونا متعین کیا، پھر ہندو طبقہ کے بعض مفاد پرست افراد کو آمادہ کیا گیا کہ وہ ان دونوں مقامات کے حاصل کرنے کی کوشش کریں چونکہ ''نواب واجد علی شاہ کا وزیر'' نقی علی خان رشوت خور ہونے کے ساتھ انگریزوں کا وفادار تھا اس لئے اس نے بھی اس افسانے کے خاکے میں رنگ بھرنے کی خدمت انجام دی اور ''واجد علی شاہ'' کو اس پر راضی کر لیا کہ حدود مسجد سے باہر لیکن اس کے احاطہ کے اندر ''رام استھان'' اور سیتا رسوئی گھر کے لئے جگہ دیدی جائے چنانچہ مسجد کے مسقّف حصہ کے بالمقابل داہنی سمت احاطہ کی دیوار سے متصل سیتا رسوئی کیلئے اور صحن مسجد سے باہر بائیں اور پورب کی طرف ''جنم استھان'' کے طور پر ۲۱ فٹ لمبی اور ۱۷ فٹ چوڑی جگہ دیدی گئی جس پر ایک بالشت بلند چبوترہ بنانے کی اجازت تھی... اسی موقع پر مسجد کے صحن کو لوہے کی سلاخوں سے گھیر دیا گیا، جو اب تک بالکل کھلا ہوا تھا، یہ ہے سیتا رسوئی اور جنم استھان کی اصل حقیقت سچ کہا ہے حافظ شیرازی نے:

چوں نہ یابند حقیقت در افسانہ زدند

جنم استھان کو جس دیومالائی حیثیت سے ثابت کیا گیا تھا وہ عوام کو تو کسی حد تک متاثر کر سکتا تھا، لیکن پڑھا لکھا طبقہ اس پر مطمئن نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اس دیومالائی کارروائی کے ایک عرصہ بعد جب فیض آباد کا نیا گزیٹیر مرتب کیا گیا تو پہلی بار اس میں یہ افسانہ بھی گھڑ کر لکھا گیا کہ ۱۵۲۸÷ میں ''بابر'' اجودھیا آیا اور ایک ہفتہ یہاں قیام کیا اس قدیم مندر (رام جنم استھان) کو ڈھا دیا اور اسی مقام پر ایک مسجد تعمیر کرائی جو اب تک ''بابری مسجد'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔

حیرت ہے کہ حکومت اتر پردیش نے ۱۹۶۰÷ میں ضلع فیض آباد کا جو گزیٹیر شائع کیا اسی میں اس انگریزی افسانہ کو بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے درج کر دیا، حکومت یوپی کا یہ رویہ بتا رہا ہے کہ ہماری حکومت ذہنی طور پر آج بھی انگریزوں کی غلام ہے جو آزاد قوم کے لئے انتہائی ننگ و عار کی بات ہے۔

اختلاف کا آغاز

بہر حال انگریزوں کی یہ چال کامیاب ہوگئی اور اجودھیا میں آباد ہندو مسلم دونوں فرقوں میں اس مسئلہ کو لے کر کشیدگی شروع ہوگئی چنانچہ سب سے پہلے ۱۸۸۵ء میں رگھوبیرداس نامی مہنت نے سب جج کی عدالت میں ایک دعویٰ دائر کیا کہ "جنم بھومی استھان پر کوئی عمارت نہیں ہے اور پوجاریوں کو جاڑا گرمی اور برسات میں تکلیف ہوتی ہے لہٰذا اس پر عمارت بنانے کی اجازت دی جائے اس نے اپنے دعویٰ میں یہ بھی ظاہر کیا کہ مسلمانوں کے اعتراض پر ڈسٹرکٹ جج نے رام جنم بھومی چبوترہ پر عمارت تعمیر کرنے سے روک دیا ہے۔

سب جج ہری کشن پنڈت نے اس دعویٰ کو مسترد کر دیا وہ اپنے فیصلے میں تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے، اس احاطہ میں جس پھاٹک سے داخلہ ہوتا ہے اس پر لفظ "اللہ" کندہ ہے اس کے فوراً بعد بائیں جانب چبوترہ ہے جس پر ہندوؤں کا قبضہ ہے اس چبوترہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ رام جنم استھان ہے چبوترہ کے چاروں طرف مسجد کی دیوار ہے چبوترہ اور مسجد کے درمیان علیحدہ علیحدہ حد بندی ہے، اگر اس چبوترہ پر مندر تعمیر ہوا اور اس میں گھنٹیاں اور سنکھ بجائے گئے اور مسلمانوں کا گذر ہوتا رہا تو مستقبل میں بہت زیادہ خون خرابہ کا اندیشہ ہے اور ہزاروں جانیں تلف ہوسکتی ہیں اس لئے مندر کی تعمیر کی اجازت دینے کا مطلب بلوا، قتل اور فساد کو دعوت دینا ہے اس لئے انصاف کا تقاضا ہے کہ مندر تعمیر کرنے کی اجازت نہ دی جائے اس مقدمہ کے دعویٰ اور فیصلہ دونوں سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جنم استھان کا چبوترہ مسجد سے باہر تھا۔

اس فیصلہ کے خلاف اپیل بھی ضلع مجسٹریٹ فیض آباد نے ۲۶/مارچ ۱۸۸۵ء کو خارج کر دی دیکھئے سول اپیل (۲۷) ۱۸۸۶ء اگرچہ اس مقدمہ کے وقت سے دونوں فرقوں کے درمیان عملی طور پر کشیدگی پیدا ہوگئی جو دن بدن بڑھتی رہی لیکن مسلمان معمول کے مطابق مسجد میں پنج وقتہ نماز پڑھتے رہے چنانچہ تعمیر کے وقت یعنی ۱۵۲۸ء/۹۳۵ھ

سے ۲۲/دسمبر ۱۹۴۹ء تک بغیر کسی رکاوٹ کے پنج وقتہ باجماعت نماز ہوتی رہی اور مستقل طور پر اس مسجد کے مؤذن اور امام مغلیہ عہد سے برابر متعین ہوتے رہے مسجد کے مصارف کے لئے مغلیہ عہد میں ساٹھ روپے سالانہ سرکاری خزانہ سے مقرر تھا نوابان اودھ کے دور میں یہ رقم بڑھا کر تین سو دو روپئے تین آنہ ۶ پائی کر دی گئی برٹش حکومت نے بھی اس رقم کو جاری رکھا پھر بندوبست اول کے وقت رقم کی بجائے دو گاؤں "بھورن پور" اور "شولاپور" متصل اجودھیا بطور معافی .... دیئے گئے، جن کی آمدنی برابر مسجد کے مصارف پر خرچ ہوتی رہی، چنانچہ رجسٹر زیر دفعہ (۳۰) میں اس وقت کے متولی، جواد حسین ساکن موضع شہنواں ڈاکخانہ درشن نگر ضلع فیض آباد اور جائداد کی تفصیل، عمارت مسجد بابری مع اراضی واقع موضع بھورن پور اور شولاپور تحصیل و ضلع فیض آباد درج ہے، پھر سنی وقف ایکٹ ۱۳/۱۹۲۰ء کے تحت چیف کمشنر وقف بورڈ نے معائنہ کر کے اس کا باقاعدہ رجسٹریشن بابری مسجد کی حیثیت سے کیا۔

غرضے کہ ۱۹۴۹ء تک تاریخی اور قانونی ہر اعتبار سے "بابری مسجد" بغیر کسی اختلاف اور نزاع کے مسجد کی حیثیت سے مسلمانوں کے قبضہ میں رہی اور مسلمان بغیر کسی مزاحمت اور روک ٹوک کے اس میں پنج وقتہ باجماعت نماز ادا کرتے تھے۔

بابری مسجد میں مجرمانہ طور پر مورتی کی تنصیب

۱۹۴۸-۴۹ء میں ملک کے اندر بالخصوص یوپی، دہلی، میوات، پنجاب وغیرہ صوبوں میں اس بڑے پیمانہ پر فرقہ وارانہ فسادات اور قتل وخوں ریزی کے حادثات ہوئے کہ اس نے ملک کے سارے نظام کو کچھ دنوں کے لئے معطل کر کے رکھ دیا، اسی اتھل پتھل اور افراتفری کے زمانہ میں ۲۲، ۲۳/دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی رات میں ہنومان گڑھی کے مہنت "ابھے رام داس" نے ضلع مجسٹریٹ "کے، کے، نائر" کی سازش اور اپنے چیلوں کی مدد سے مسجد کی دیوار پھاند کر مسجد میں گھس گئے اور مسجد کے درمیانی گنبد میں عین محراب کے اندر "رام کی مورتی" رکھ دی صبح کو جب مسلمان فجر کی نماز پڑھنے گئے تو مورتی کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے اور اسی وقت مورتی کو نکالنے کا مطالبہ کیا، چنانچہ ۲۳/کی صبح کو ڈیوٹی پر

متعین پولیس ''ماتو پرشاد'' نے اس وقت کے تھانہ انچارج ''شری رام دیو'' کو جو تحریری رپورٹ درج کرائی اس میں لکھا ہے کہ ''ابھے رام داس، شکل داس، سدرشن داس، اور پچاس، ساٹھ آدمی نامعلوم نے مسجد میں مورتی استھاپت (نصب) کر کے مسجد کو ناپاک کر دیا ہے جس سے نقض امن کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے اسی رپورٹ کی بنیاد پر سٹی مجسٹریٹ ضلع فیض آباد نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت مسجد اور اس سے ملحق گنج شہیداں کو قرق کر لیا اور پریہ دت رام چیرمین میونسپل بورڈ فیض آباد کو ریسیور مقرر کر کے مسجد پر تالا ڈال دیا اور فریقین کے نام نوٹس جاری کر دی کہ وہ اپنے اپنے دعویٰ کے سلسلے میں ثبوت پیش کریں۔

اس انتہائی مجرمانہ اور غیر مذہبی حرکت پر پورے ملک کے مسلمانوں میں اضطراب اور بے چینی پھیل گئی چنانچہ جمعیۃ علماء کے اکابر حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی وغیرہ نے صورت حال کی نزاکت سے اس وقت کے وزیر اعظم آنجہانی ''جواہر لال نہرو'' کو مطلع کیا پنڈت جواہر لال جی نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری پنتھ کو لکھا کہ وہ ضلع مجسٹریٹ کو حکم دیں کہ مسجد سے مورتی فوراً نکال دی جائے چنانچہ پنتھ نے وزیر اعظم کے حکم کے مطابق ضلع مجسٹریٹ کو یہ آرڈ بھیج دیا چونکہ ضلع مجسٹریٹ اس سازش میں خود ملوث تھا اس لئے اس آرڈر پر عمل کرنے کے بجائے اس نے ابھے رام داس وغیرہ کو نئی صورت حال کی اطلاع دیدی اور ان سے کہا کہ میں اس آرڈر کے نفاذ میں کچھ تاخیر کر دوں گا تم لوگ اس درمیان میں عدالت سے اسٹے حاصل کرلو ان لوگوں نے اس کے کہنے کے مطابق اس حکم کے خلاف عدالت سے اسٹے حاصل کر لیا اس طرح مورتی مسجد سے ہٹائی نہ جا سکی، چنانچہ ضلع مجسٹریٹ، کے، کے نائر سے پنتھ جی نے اسی بنیاد پر استعفا لے لیا، لیکن اس کے بعد پنتھ جی نے اس معاملہ میں دلچسپی نہیں لی اور مورتی اسی جگہ باقی رہی۔

مقدمات کا سلسلہ

مسجد میں مورتی کو غیر قانونی طور پر رکھنے کے تقریباً ۲۳-۲۴ دن بعد ۱۶/جنوری

۱۹۵۰÷ کو ہندو فرقہ کے ایک شخص گوپال سنگھ نامی کی طرف سے ظہور احمد، حاجی محمد فائق، حاجی پھیکو، احمد حسین عرف اچھن، محمد سمیع، ڈی ایم، سٹی مجسٹریٹ اور سرکار اتر پردیش کو پارٹی بنا کر یہ دعویٰ دائر کیا گیا کہ یہ جنم بھومی ہے ہم یہاں پوجا پاٹ کرتے ہیں مسلمانوں اور ضلع انتظامیہ نے اس میں رکاوٹ ڈال دی ہے لہٰذا اس رکاوٹ کو ختم کر کے ہمیں پوجا پاٹ کی اجازت دی جائے۔ یاد رہے کہ ۱۸۸۵÷ کے دعویٰ میں جو رگھوناتھ داس کی طرف سے دائر کیا گیا تھا، اس میں مسجد کے باہر چبوترہ کو جنم استھان بتایا گیا تھا اور اسی پر عمارت بنانے کی اجازت چاہی گئی تھی اور اس دعویٰ میں جو نظری نقشہ پیش کیا گیا تھا اس میں مسجد کو ''بابری مسجد'' ہی کی حیثیت سے دکھایا گیا تھا۔

یکم جولائی ۱۹۵۶÷ کو ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے عدالت میں جواب دعویٰ داخل کرتے ہوئے اپنے بیان کے پیراگراف ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، اور ۱۸ میں لکھا ہے:

> یہ جائداد نزاعی ''بابری مسجد'' کے نام سے مشہور ہے اور لمبے عرصے سے مسجد کے طور پر مسلمانوں کے ذریعہ عبادت کیلئے استعمال ہوتی چلی آرہی ہے اس کا استعمال رام چندر جی کے مندر کے روپ میں کبھی نہیں ہوا ۲۲/دسمبر ۱۹۴۹÷ کی رات میں رام چندر جی کی مورتی کو چوری اور غلط ڈھنگ سے مسجد کے اندر رکھ دیا گیا، اس غلط اور غیر قانونی واقعہ سے مسلمانوں میں کافی بےچینی پیدا ہوگئی اور علاقے میں نقض امن کا خطرہ پیدا ہوگیا اس لئے سٹی مجسٹریٹ گرودت سنگھ نے ۲۳/دسمبر ۱۹۴۹÷ کو دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی اور اسی تاریخ کو ایڈیشنل مجسٹریٹ ''شری مارکھنڈے سنگھ نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت اس مسجد کو قرق کر کے ریسیور مقرر کر دیا۔''

ڈپٹی کمشنر کے جواب دعویٰ سے ایک ماہ پہلے یعنی یکم جون ۱۹۵۰÷ کو ایس، پی ضلع فیض آباد کرپال سنگھ نے بھی جواب دعویٰ داخل کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ

> ''یہ زمانۂ قدیم سے ''بابری مسجد'' ہے اور اس میں ہمیشہ سے مسلمان نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں ہندوؤں کا اس سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں ہے۔''

اس مقدمہ کے بعد ہندوؤں کی جانب سے دو مقدمات اور دائر کئے گئے ایک پریم ہنس رام چندر داس کی جانب سے اور دوسرا نرموہی اکھاڑا کی طرف سے، اسکے بعد ۱۹۶۸ء میں یوپی سنٹرل وقف بورڈ اور مسلمانوں کی جانب سے ایک مقدمہ دائر ہوا جس میں جمعیۃ علماء کی طرف سے مولانا نصیر احمد صاحب فیض آبادی بھی مدعی تھے، اس دعویٰ میں کہا گیا تھا کہ یہ "بابری مسجد" مسلمانوں کی مسجد ہے جس میں وہ ۱۵۲۸ء سے برابر عبادت کرتے چلے آرہے ہیں یہ مسجد ان کو واپس دی جائے اور نماز میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔

اب تک ان تمام مقدموں کی فائل الگ الگ تھیں بغرض سہولت عدالت کے حکم سے انہیں یکجا کر دیا گیا اور سنی سنٹرل وقف بورڈ کے مقدمہ ۱۲/۶۱ کو رہنما کیس قرار دیدیا گیا۔

اسی اثناء میں ریسیور پریہ دت کا انتقال ہوگیا، تو عدالت نے ان کی جگہ "شری کے کے رام ورما" آنریری مجسٹریٹ کو ریسیور مقرر کیا اسی درمیان مسلمانوں کو اطلاع ملی کی مسجد میں تبدیلی کی جارہی ہے، اس لئے انھوں نے رام ورما کو ریسیور کے عہدہ سے الگ کرنے کی درخواست دی مسلمانوں کی شکایت کو صحیح مانتے ہوئے سول جج نے رام ورما کو ریسیور کے عہدہ سے ہٹانے کا حکم دیدیا اس حکم کے خلاف ہندوؤں نے ہائی کورٹ لکھنؤ بینچ میں "رویژن" دائر کرکے اسٹے لے لیا اس موقع پر رہنما کیس اور جملہ مقدمات کی فائل، ہائی کورٹ میں طلب کرلی گئی اور فیض آباد میں تمام مقدمات رک گئے اور تقریباً پندرہ سال کی طویل مدت گذر گئی مگر فیض آباد کی عدالت میں اس مقدمہ کے سلسلے میں کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی حالانکہ اس مدت میں مسلمانوں کی جانب سے بار بار درخواست پیش کی گئی کہ اس کا فیصلہ جلد کر دیا جائے اور ہائی کورٹ کی طرف سے بھی عدالت فیض آباد کو ہدایت دی گئی کہ اس مقدمہ کا جلد فیصلہ کر دیا جائے مگر اس کا کوئی اثر نہیں لیا گیا۔

دوران مقدمہ خلاف قانون مسجد میں تبدیلیاں

گذشتہ سطور میں معلوم ہو چکا ہے کہ "بابری مسجد" کے چاروں سمت چہار دیواری ہے، مسجد کا صدر دروازہ اتری سمت ہے اس دروازے پر موٹے خط میں لفظ اللہ کندہ تھا مگر

ریسیور اور پولیس کی نگرانی کے ہوتے ہوئے اسے کھرچ کر مٹادیا گیا اور دروازے پر "جنم استھان مندر" کا ایک بورڈ لگا دیا گیا، احاطہ کی اتری چہار دیواری اور صحن مسجد کے درمیانی خالی جگہ پر سفید و سیاہ سنگ مرمر کا فرش بنالیا گیا ہے جسے "پری کرما" (مطاف) کا نام دیا گیا ہے، صحن مسجد میں اتری جانب ہینڈ پائپ گاڑلیا گیا ہے، صحن مسجد سے باہر پوربی سمت ایک سفالہ پوس مندر تعمیر کرلیا گیا ہے، اسی کے متصل مہنتوں کی قیام گاہ بھی بنالی گئی ہے، دکھن سمت اس چبوترہ پر جسے شروع میں رام جنم استھان کا نام دیا گیا ہے، مندر تعمیر کرلیا گیا ہے اور اسی کے متصل دو مندر اور بھی بنالئے گئے ہیں، مسجد کے درمیانی گنبد پر ایک جھنڈا لگا دیا گیا ہے، یہ ساری تبدیلیاں ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۶ء کی درمیانی مدت میں کی گئی ہیں جبکہ ریسیور کا تقرر قانونی طور پر اس لئے ہوتا ہے کہ متنازع عمارت میں فریقین کی جانب سے کوئی ترمیم واضافہ نہ کیا جاسکے لیکن یہ تمام تبدیلیاں ہوتی رہیں نہ مقرر ریسیور رام ورما نے اس کا کوئی نوٹس لیا اور نہ وہاں متعین نگراں پولیس نے اس لئے کہ جذباتی طور پر یہ سب لوگ ان غیر قانونی تبدیلیوں میں باہم شریک کار تھے۔

مسجد مندر بنادی گئی

ہائی کورٹ بنچ لکھنؤ میں ریسیور ورما کے سلسلہ میں داخل رٹ زیر سماعت ہے اور قانونی طور پر ابھی اس کے خلاف اپیل نہیں کی جاسکتی لیکن ۲۵/جنوری ۱۹۸۶ء رمیش چندر پانڈے نامی ایک غیر متعلق شخص نے جواب تک کے کسی مقدمہ میں فریق نہیں ہے منصف صدر فیض آباد کی عدالت میں مقدمہ (۲) ۱۹۵۰ء میں ایک نئی درخواست دی کہ جنم استھان میں پوجا پاٹ کرنے کی چھوٹ ہونی چاہئے لہٰذا عدالت ضلع انتظامیہ کو حکم دے کہ جنم بھومی یا بابری مسجد کا تالا کھول دے تاکہ ہم اور ہندو لوگ بغیر کسی روک ٹوک کے پوجا کرسکیں اس پر منصف صدر نے.... یہ کہتے ہوئے درخواست خارج کردی کہ اس مقدمہ کی رہنما فائل ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے اس لئے اس درخواست پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا اس فیصلہ کے خلاف ڈسٹرکٹ جج مسٹر کے، ایم پانڈے کی عدالت میں سول اپیل

نمبر(۶) ۱۹۸۲÷ ۳۰ر جنوری کو داخل کی گئی اور ۳۱ر جنوری کو دیوانی کے سرکاری وکیل نرائن دت کھتری پیش ہوگئے ضلع مجسٹریٹ نے ڈی، ایم اور ایس، پی کا بیان لینا چاہا چنانچہ یکم فروری ۱۹۸۶÷ کو یہ دونوں حکام بھی حاضر ہوگئے جن سے ضلع مجسٹریٹ نے سوال کیا کہ اگر مسجد یا جنم بھومی کا تالا کھول دیا جائے تو کیا آپ لا اینڈ آرڈر بحال کرسکیں گے جس پر انھوں نے کہا کہ یہ ہماری ڈیوٹی ہے اور ہم اسے پورا کرنے کی کوشش کریں گے چنانچہ اس فرضی کارروائی کے بعد اسی دن یعنی سنیچر کو پونے پانچ بجے جج نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ ضلع انتظامیہ اس جگہ کا تالا کھول دے اور رمیش چندر پانڈے اور دیگر ہندوؤں کو پوجا پاٹ کرنے کی کھلی چھوٹ دی جائے اس میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے نیز ضلع انتظامیہ لا اینڈ آرڈر بحال رکھنے کیلئے مناسب کارروائی عمل میں لائے۔

مسلمانوں کی طرف سے اس مقدمہ کے سلسلے میں تین درخواستیں دی گئیں لیکن جج نے یہ کہتے ہوئے کہ معاملہ ضلع انتظامیہ سے متعلق ہے اس میں مسلمانوں کو فریق بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تینوں درخواستیں رد کردیں اور فیصلہ کے فوراً بعد ۵ر بج کر ۱۹ر منٹ پر بابری مسجد کا دروازہ کھول دیا گیا اور ہزاروں ہندو پوجا پاٹ کیلئے اس وقت مسجد میں پہنچ گئے اس طرح سے ۴۵۸ سال کی قدیم مسجد بیک جنبش قلم مندر میں تبدیل کردی گئی۔

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ؀

اس مقدمہ کا یہ پہلو کس قدر ڈرامائی ہے کہ اس میں مدعی رمیش پانڈے، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اندر کمار پانڈے، ڈسٹرکٹ جج کے، ایم پانڈے اور وکیل ویریشور دودیدی سب کے سب پنڈٹ برادری سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے اس میں جو فیصلہ ہونا تھا وہ پہلے ہی سے ظاہر تھا۔

اسی کا شہر وہی مدعی، وہی منصف — ہمیں یقین تھا ہمارا قصور نکلے گا

فیصلہ پر ایک نظر

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ پونے پانچ بجے ہوتا ہے لیکن اجودھیا اور

فیض آباد میں پی، اے، سی اضافی طور پر دن کے دو بجے ہی لگادی گئی اور مسلمانوں کے محلوں میں ان کا زبردست گشت شروع ہوگیا اور فیصلے سے پہلے ہی عدالت کو پولیس اور پی، اے سی نے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

فیصلہ سے قبل یہ تیاریاں صاف بتلا رہی ہیں کہ جو کچھ ہوا وہ پہلے سے طے شدہ اسکیم کے تحت ہوا ہے، یہ بات بھی کم حیرت کی نہیں ہے کہ صرف پانچ دن کے اندر منصف عدالت سے لے کر ضلع جج کی عدالت تک مقدمہ کی ساری کارروائی عمل میں آگئی اور فیصلہ بھی کردیا گیا ہندوستان کی عدالتوں میں کیا مقدمات اتنی ہی سرعت کے ساتھ نمٹائے جاتے ہیں، کیا ہندوستانی عدلیہ اس کی کوئی مثال پیش کرسکتی ہے؟

پھر جو مقدمہ ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہو اس کی اپیل اور وہ بھی ماتحت عدالت میں کس قانونی دفعہ کے تحت کی گئی ہے؟

کیا کسی مقدمہ میں فریق ثانی کو نوٹس دیئے بغیر فیصلہ کردینا قانونی رو سے درست کہا جاسکتا ہے؟

آخری بات

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ اسلام اور مسلمانوں پر اس طرح کے بلکہ اس سے بھی سنگین تر حالات پیش آئے ہیں لیکن مسلمانوں نے اپنے استقلال و استقامت، صبر وتحمل اور حکمت و جرأت سے ہر موقع پر حالات کے رخ کو موڑ دیا ہے اس لئے آج بھی ہمیں تاریخ سے سبق لینا چاہئے غم وغصہ، مایوسی و نامرادی، جھنجھلاہٹ اور چیخ و پکار کے بجائے صبر واستقامت اور جرأت سے خدا کے سہارے آگے بڑھنا چاہئے ظلم و جبر کی کشتی زیادہ دنوں تک نہیں چلتی، کامیابی و کامرانی ہمیشہ حق وانصاف کے قدم چومتی ہے۔

وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین.

☆ ☆ ☆